ملی اور لسانی زوال پذیری

سید عابد علی عابد

کسی قوم کی زبان بھی دوسرے کوائف و مظاہر کی طرح اس کے اخلاق ، معاشرتی ، ثقافتی ، سیاسی اور عرفانی انحطاط کی ترجمان ہوتی ہے ۔ بلکہ سچ پوچھیے تو لسانی شہادت ہی دنیا کی تمام شہادتوں میں وقیع تر ہے کہ جس طرح بیباکانہ انسان جھوٹ بول لیتا ہے انسان کے وضع کردہ الفاظ کو یہ قدرت حاصل نہیں ۔ کوئی قوم اپنی زوال پذیری کو کتنا ہی دبیز پردوں میں چھپا کر کیوں نہ رکھے اس کے الفاظ اصل حقیقت کو اس طرح آجاگر کرتے ہیں کہ شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی ۔

اس بات سے قطع نظر کہ الفاظ محتمل معانی ہونے کے اعتبار سے متغیر ہوجاتے ہیں اور اپنے اردگرد مترادفات کا ایک ذخیرہ جمع کر لیتے ہیں ، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قانون ایتلاف افکار کے ماتحت کسی قوم کی اخلاق بلندی یا زوال پذیری کے متعلق اس کے الفاظ کے معنی میں تغیر پیدا ہوتا رہتا ہے ۔ اس قسم کے فساد لفظ کو جو دراصل ظواہر سے عبارت ہے دراصل فساد باطن کا مظہر سمجھنا چاہیے ۔ جب تک کوئی قوم اخلاق ، عرفانی اور معاشرتی اعتبار سے سربلند رہتی ہے اس کا ذخیرۂ الفاظ ، اس کے محاورے ، اس کی ضرب الامثال ، اس کا روزمرہ اور اس کا انداز بیان قوم کے علو شان کی شہادت دیتا ہے ۔ جونہی قوم میں زوال پذیری کے جراثیم پرورش پانے لگتے ہیں گویا الفاظ کو بھی گھن لگ جاتا ہے اور وہ بھی افراد واجتماع کے باطنی فساد کی شہادت دینے لگتے ہیں ۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں لسانی شہادت مورخوں کے بیانات پر اور کیا خارجی اور کیا اندرونی تمام استنادات پر تفوق رکھتی ہے کہ الفاظ جھوٹ بولنے سے گریز کرتے ہیں ۔

ایک نکتہ طراز مصنف زبان کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''اس [انسان] نے اپنی زندگی کے پیچ در پیچ راہوں میں کیا کیا تخم ریزی کی ہوگی جو اس کی زبان کے رگ و ریشوں میں سیاہی کے بد نما دھبے جا بجا نظر آرہے ہیں ۔ ضرور ہے کہ بدی اور شرارت کے آثار پہلے

سرزد ہوئے ہوں گے اور پھر وہ الفاظ جواس بدی اور شرارت کے شاہد ہیں زبان میں پیدا ہو گئے . . . رنج وافسوس سے ماننا پڑتا ہے کہ کئی ایک زبانوں میں گناہ کے لیے الفاظ نیکی کے الفاظ سے زیادہ ہیں۔''[1]

آج کی صحبت میں میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ چند لفظوں کا ذکر کرتا ہوں کہ داستاں دراز ہے اور ''افسانہ از افسانہ می خیزد'' والا معاملہ ہے۔

میں نے جس خاص ترتیب کی طرف اشارہ کیا ہے اس کے خد و خال تب روشن ہوں گے کہ میں قریباً ربع صدی پیچھے لوٹوں اور ان ایام کی چنگاریاں سلگاؤں جن کے متعلق سعدی کہ گیا ہے :

جوانی کجائی کہ یادش بخیر

قصہ یہ ہے کہ جب حافظ محمود شیرانی مرحوم و مغفور جن سے دو حرف پڑھنے کی سعادت مجھے حاصل ہوئی ہے دانشگاہ پنجاب سے سبکدوش ہوئے تو ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (جو بعد میں پرنسپل اورنٹل کالج ہوئے) کی تجویز پر متعلقہ ارباب اقتدار نے مجھے فارسی کے منتہی طلباء کو درس دینے کی خدمت تفویض کی :

کلاہ گوشۂ دھقاں بہ آفتاب رسید

پہلے راقم السطور نے ایم - اے - فارسی کے طلباء کو علوم شعریہ سے آشنا کرنے کی کوشش کی اور پھر استاد گرامی قدر (شیخ محمد اقبال مرحوم) نے ایما فرمایا کہ تاریخ ادبیات ایران کے موضوع پر بھی کچھ خطبات دوں - اس سلسلے میں مجھے تصوف کے ارتقاء اور اس کی علامات و رموز کا مطالعہ کرنا پڑا - انہی دنوں کی بات ہے کہ پروفیسر نکلسن نے ''قاموس اخلاق و مذاہب'' میں اسلامی اور ایرانی تصوف پر جو مقالہ لکھا تھا وہ نظر سے گزرا - انشراح صدر کی سی کیفیت پیدا ہوئی اور جو بات نہایت معنی خیز ہاتھ آئی وہ یہ تھی کہ حافظ کے زمانے میں کلمہ ''صوفی،، مرد ریا کار اور گنہگار کے معنی میں مستعمل ہو گیا تھا - اس کی توجیہ پروفیسر صاحب موصوف نے یہ فرمائی کہ حافظ کے زمانے تک صوفیوں کے مختلف سلسلے ایران اور اس کے گرد و نواح میں

---

1 - احمد دین ''سرگزشت الفاظ،، لاہور، مطبع کریمی ، بار اول - نایاب کتاب ہے اور جس نسخہ سے کام لیا گیا ہے وہ مملوکۂ راقم ہے - پرانے رفیق کار خا م محی الدین مرحوم و مغفور نے تحفۃ عطاء فرما کے یہ صورت پیدا کر دی تھی کہ

سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا

مصروف کار تھے ۔ خانقاہیں تھیں ، ذکر و فکر تھا ، خلوت پسندی تھی ، گوشہ گزینی تھی ۔ نہیں تھا تو اکثر سلسلوں میں ذوق عمل نہ تھا ۔ اس پر ستم بالائے ستم یہ کہ بعض صوفیاء نے جہاں تواجد کو (سماع میں) تقرب الٰہی کا ذریعہ بنایا وہاں نفس پرستوں نے مظاہر حسن و جمال کی پرستاری کی آڑ لے کر امردوں سے عشق و محبت کی پینگیں بڑھانی شروع کیں ۔ صرف یہی نہیں بلکہ صوفیوں کے مختلف سلسلوں کے اختلافات فروعی باتوں سے ہٹ کر اصل اصول تک بھی جا پہنچے ۔ چنانچہ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ ایک فرقہ دوسرے فرقہ کے صوفیوں کو ریا کار ، گنہگار اور فاسق سمجھتا تھا اور جب انہیں کلمۂ صوفی سے ملقب کرتا تھا تو گویا انہیں معناً گالی دیتا تھا ۔ مراد یہ ہوتی تھی کہ صوفی وہ ہیں جو فسق و فجور میں مبتلا ہیں ، امرد پرستی کی لعنت میں گرفتار ہیں ، شرع کی پابندی سے گریز کرتے ہیں ، اور یہ آڑ لے کر کہ اصل عبادت تو تزکیۂ قلب ہے باقی مراسم عبادت گذاری کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ۔ ان حالات کو پیش نظر رکھ کر نکلسن نے کہا کہ حافظ کے کلام[1] میں کلمۂ صوفی ریاکاری ، فسق و فجور اور دیانت علم کے فقدان کی علامت ہے ۔ جو لوگ اس نکتہ سے بے خبر ہیں وہ حافظ کے کلام کے تضاد ظاہری سے بہت پریشان ہوتے ہیں کہ خود صوفی ہے یا کم از کم صوفی ہونے کا مدعی ہے لیکن کلمۂ صوفی کو یوں بھی استعمال

---

1 - خواجہ حافظ کے متعلق بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں ، لیکن ان مآخذ کو بنیادی تصور کرنا چاہیے : ۱ - ''حافظ شیریں سخن،، تالیف محمد معین (فارسی) - ۲ - ''بحث در آثار و افکار و احوال حافظ،، تالیف قاسم غنی (فارسی) - ۳ - ''شعر العجم،، جلد دوئم - ۴ - ''تاریخ ادبیات ایران ،، براؤن ، جلد سوئم - ۵ - ''تاریخ ادبیات ایران،، سلیم نیساری، جلد دوئم- ۶- ''تاریخ مفصل ایران،، تالیف عباس اقبال (ازحملۂ چنگیز تا تشکیل دولت تیموری) - ۷ - '' تاریخ ادبیات ایران،، رضازادہ شفق ۔ تاریخ وفات اس قطعہ سے برآمد ہوتی ہے :

چراغ اہل معنی خواجہ حافظ کہ شمعے بود از نور تجلی
چو در خاک مصلی ساخت منزل بجو تاریخش از خاک مصلی
۷۹۱ھ

محمد گل اندام نے (دیباچہ نگار حافظ) نے یہی تاریخ اختیار کی ہے لیکن جامی نے ''نفحات الانس'' میں ۷۹۲ھ میں دکھائی ہے۔ خواندمیر اور فصیحی بھی جامی کی پیروی کرتے ہیں ۔

کرتا ہے کہ اس سے مداہنت اور ریا کے معنی مترشح اور متبادر ہوتے ہیں ۔

صوفی (زمانۂ مابعد میں اقبال کے کلام میں اس کلمہ کی اہانت) : یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ اقبال خود تصوف کے مخالف نہ تھے ۔ البتہ جب صوفیوں نے تصوف کے دو ٹکڑے کر دیے یعنی (الف) عربی اور اسلامی ، (ب) عجمی (ان تعلیمات کے ساتھ جو اسلام کے اصل اصول کے منافی ہیں) اور شیخ محی الدین ابن عربی نے نظریۂ وحدت الوجود کو یوں فروغ بخشا کہ در و بام گونجنے لگے تو اقبال نے عمیق مطالعہ کے بعد اس نظریہ کو جو تمام صوفیوں پر مسلط ہو چکا تھا بڑی سختی سے مسترد کر دیا ۔ حافظ کا فلسفۂ حیات بھی اسی وحدت وجود کا مفسر تھا جس میں بے ثباتیٔ عالم ، نفیٔ خودی ، ترک عمل ، خلوت گزینی ، گوشہ نشینی اور عیش امروز کے عوامل بڑی شدت سے کارفرما ہو گئے تھے ۔ اس نظریہ کی رو سے دنیا و مافیہا کا کوئی وجود نہیں ۔ سب کچھ فریب نظر ہے ۔ ظواہر فریب نظر ہیں ۔ اس اعتبار سے انسان تسخیر کائنات تو خاک کرے گا خود ہیچ درہیچ ہو کر رہ جائے گا۔[1]

یہی بات ملحوظ رکھ کر علامہ اقبال نے '' اسرار خودی، ، میں حافظ اور افلاطون پر کڑی تنقید کی ہے ، اور بے عمل گروہ کو گوسفندوں سے تعبیر کیا ہے کہ سر جھکائے جدھر چرواہا لے جائے چلے جاتے ہیں ، اور سر اٹھا کر حیات خارجی کی طرف دیکھتے بھی نہیں ۔ جب ان اشعار کے خلاف مخالفت کا طوفان اٹھا تو علامہ نے یہ شعر حذف کر دیے ۔ اب کہ اس نزاع سے پیدا شدہ گرد و غبار بیٹھ چکا ہے اور اقبال کا موقف

---

1 - ڈاکٹر ابوسعید نورالدین ''اسلامی تصوف اور اقبال'' اقبال اکادمی ، کراچی ، صفحات ۲۵۰ تا ۲۵۳ ۔ اس سلسلے میں بھی بحث نے بہت گرما گرمی اختیار کی کہ حافظ اصلاً صوفی تھے بھی یا نہیں ۔ اور آخر راہ اعتدال یہ ٹھہری کہ حافظ کے بہت سے اشعار میں شراب و شاہد سے واقعتاً شراب و شاہد ہی مراد ہے اور ان کے خاصے اشعار کی صوفیانہ تاویل ممکن نہیں ۔ چنانچہ ڈاکٹر ابوسعید موصوف نے یہ بحث بھی چھیڑی ہے اور اسے افلاطون تک پہنچا کر دم لیا ہے ۔ پھر اس بات کی تشریح کی ہے کہ خواجہ حافظ کی تعلیمات سے پاک و ہند کے مسلمان بہت زیادہ متاثر ہوئے ۔ یہ بات اقبال کی نظر میں بہت خطرناک تھی کیونکہ ۱۸۵۷ کے ہنگامہ کے بعد مسلمانوں کو تیاگ کی ضرورت نہ تھی ، وہ ذوق عمل کے محتاج تھے ۔ حالی نے بھی اس نکتہ کو بہت اہمیت دی ہے (دیکھیے ''حیات سعدی'') ۔

صاف پانی کی طرح نتھر کر سامنے آ گیا ہے ، ان محذوف اشعار کو نئے نسخوں میں شامل کر دینا چاہیے تا کہ '' اسرار خودی ،، کامل اصلاً قاری کے پیش نظر ہو۔

میں نے عرض کیا تھا کہ نکلسن کے فیضان سے یہ نکتہ میرے ہاتھ آیا کہ آٹھویں صدی ہجری میں مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے صوفی ایک دوسرے کو مورد مذمت گرداننے کے لیے یہ کلمہ استعمال کرتے تھے۔ تو پہلے حافظ کے ہاں یہ شہادتیں دیکھ لیجیے کہ وہ صوفی جو کبھی تزکیۂ قلب اور انجلائے باطن کا مدعی تھا اور ظواہر مراسم شریعت بھی بجا لاتا تھا بتدریج اس کی کیا حالت ہوگئی ۔ حافظ جگہ جگہ صوفیوں کی اہانت کرتا ہوا کہتا ہے (یعنی ان صوفیوں کی جو عجمی ، ویدانتی اور نصرانی تصورات کے پروردۂ آغوش تھے) :

صوفی بیا کہ آئینۂ صافیست جام را   تا بنگری صفائے مئے لال فام را
بوئے یک‌رنگی از این وضع نه می آید خیز   دلق آلودهٔ صوفی به مئے ناب بشوی

یہ اشعار خاص طور پر قابل غور ہیں :

صوفی نہاد دام و سر حقه باز کرد   بنیاد مکر با فلک حقه باز کرد
ساقی بیا که شاهد رعنائے صوفیان   دیگر به جلوه آمد و آغاز ناز کرد
اے دل بیا که ما به پناه خدا رویم   زانچ آستین کوته و دست دراز کرد
صوفی گلے به چین و مرقع به خار بخش   وین زهد خشک را به مئے خوشگوار بخش
ساقی بیا که شد قدح لاله پر زمے   طامات تابه چند و خرافات تا به کے[1]

---

1 - واضح رائے عالی ہو کہ صوفی عالم تواجد میں کیفیت سرور میں یا اصطلاحاً مقام سکر میں عجیب و غریب دعوے کرتے ہیں ، اور اپنی ذات کو اتنے ارفع مقام پر پہنچاتے ہیں کہ انسان کی عقل کو تارے نظر آتے ہیں ۔ یہ لاف و گزاف جو قرون اولیٰ کے بعد جب تصوف واقعی تقرب حق کا ذریعہ تھا بہت سی شکلیں اختیار کرتا ہے جن میں سے اناالحق ایک ہے ۔ صوفیوں نے اپنے سخنان بے ہودہ کے لیے کچھ کلمات بھی وضع کر لیے ہیں ، مثلاً ''شطحیات ۔ به اصطلاح صوفیه چیز هائے مخالف ظاهر شرح گفتن و کلمات خلاف شریعت به زبان آوردن از منتخب'' به استناد ''فرهنگ آنند راج'' ۔ ''فرهنگ اصطلاحات صوفیه'' میں مندرج ہے کہ ابن العربی کے قول کے مطابق جس کلمہ سے بوئے خود پسندی آئے لیکن محقق یہ کلمہ کم استعمال کرتے ہیں ،

[بقیہ صفحہ ۱۰۲ پر

قصہ یہ ہے کہ صوفیوں نے جب یہ دیکھا کہ شریعت کے مراسم ظاہری پورا کرنے میں تو بڑی زحمت ہے تو غرض کے بندوں نے بے ریا اکابر صوفیاء کی تعلیم کو اپنے مطلب کے سانچے میں ڈھال لیا ، مثلاً ''فرہنگ اصطلاحات صوفیہ'' میں طریقت کے متعلق لکھا ہے وہ ''سیرت جو سالک راہ معرفت سے مخصوص ہو اور ترقی' مقامات پر منتج'' اور حقیقت کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ ''یہ وصل خداوند کے مقام میں انسان کی اقامت ہے اور اس کے اسرار سے تنزیہ کے محل پر پہنچ کر آگاہ ہوتا ہے یا اوصاف بندہ کا استیصال اور غلبۂ اوصاف حق کو کہتے ہیں''۔ باقی رہی طریقت تو معین نے شریعت ، طریقت اور حقیقت تینوں سے بڑی سیر حاصل بحث کی ہے ۔ اس کے مندرجات کا خلاصہ یہ ہے کہ اصل مطلوب صوفیوں کی نظر میں حقیقت ہے اور وہ پیدا ہوتی ہے طریقت کے رموز سے آگاہ ہونے کے بعد اور اس کے احکام پر عمل کرنے کے بعد ۔ شریعت تو صرف نشان راہ ہے ۔ انسان پابند شریعت ہو تو طریقت کی منزل تک پہنچ جاتا ہے ، لیکن اس کے بعد شریعت حلقۂ بیرون در ہو جاتی ہے اور طریقت ہی انسان کو حقیقت تک پہنچاتی ہے جو مطلوب اصلی' سالک ہے ۔[1]

(یعنی شطحیات) ۔ بہر حال شطحیات کا وجود مسلم اور اس کے معنی ظاہر ۔ حافظ نے جو طامات کا کلمہ برتا ہے اس سلسلے میں صاحب ''فرہنگ آنند راج،، لکھتے ہیں : ''طامت روز قیامت'' ۔ اسی سے اندازہ کر لیجیے کہ صوفی کس قدر اپنی بلندی' رفعت مقام کے متعلق لاف و گزاف کرتے ہوں گے کہ اصطلاح میں اسے طامت کہا گیا اور خرافات سے اسے معطوف کیا گیا ۔ مراد یہ کہ اتنی خرافات ہوتی ہے کہ قرب قیامت کا ڈر ہوتا ہے ۔

1 - دیکھیے بحث در ''آثار و افکار و احوال حافظ'' جلد دوئم ، ص ۲۰۸ - اس کے بر خلاف ہجویری یعنی داتا گنج بخش مرحوم و مغفور جن کی تصنیف ''کشف المحجوب'' فارسی میں تصوف کی پہلی تالیف ہے فرماتے ہیں کہ علم تین قسم کے ہوتے ہیں ــ علم من اللہ ، علم مع اللہ ، علم با للہ ۔ علم من اللہ شریعت ہے ، اور علم مع اللہ طریقت ہے ۔ جب تک شریعت کے احکام پر عمل نہ ہوگا معرفت یعنی علم مع اللہ حاصل نہ ہوگا اور اس کے بغیر حقیقت تک رسائی نا ممکن ہے (''کشف المحجوب'' اردو ترجمہ لاہور؛ اور 'کشف المحجوب' چاپ ذوکوفسکی ،

[بقیہ صفحہ ۱۰۳ پر

اقبال نے اس معاملے کا فیصلہ یوں کیا کہ حقیقت کو عین شریعت بنا ڈالا۔ وہ یوں کہ انھوں نے کہا کہ شریعت مجموعۂ احکام خداوندی ہے اور طریقت اس مجموعہ کی صداقت کو تہ قلب میں محفوظ کرنے کا نام ہے۔ جب ایسا ہو جائے گا تو حقیقت مطلقہ کا سراغ خود بخود لگ جائے گا۔ اقبال کا یہ نظریہ اس کی مختلف کتابوں میں منتشر ملتا ہے، مثلاً مکاتیب میں، مختلف مطبوعہ مضامین میں۔ خطبات میں بھی ایسے مقامات ہیں جہاں یہ مفہوم متبادر ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں خطبات کا ترجمہ (سید نذیر نیازی) اور خطبات کا خلاصہ (فکر اقبال) تالیف خلیفہ عبد الحکیم کا مطالعہ کرنے سے بہت سی گتھیاں سلجھ جائیں گی۔

اب اس کے بعد اگر اقبال عجمی تصوف کے تدریجی زوال کو سامنے رکھ کر نام نہاد صوفیوں کی مزید اہانت کریں تو کچھ تعجب نہ ہونا چاہیے۔ ان کے کلام میں صوفی مرد ریا کار کے رتبے سے بھی نیچے آ کر ایک مرد بے عمل بن جاتا ہے جو ذوق ایمان سے اس قدر عاری ہے کہ عزیمت کے مقام کو بھی نہیں جانتا، یہاں تک کہ بعض اوقات ایمان کے آخری درجے سے بھی ہٹ جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں (کہ صوفی مسلک تصوف کی تدریجی زوال پذیری کی علامت بن جاتا ہے):

میرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں — کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو
میں ایسے فقر سے اے اہل حلقہ باز آیا — تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری
نہ فقر کے لیے موزوں نہ سلطنت کے لیے — وہ قوم جس نے گنوایا متاع تیموری

ص ۱۸، بہ استناد معین مذکور)۔

پہلے صوفیاء نے معرفت کے یہ تین درجے دیانت علمی کے مطابق مقرر کیے تھے لیکن بعد کے صوفیوں نے یہ قرار دیا کہ اصل چیز اتصال بہ حقیقت ہے اور وہ بغیر طریقت کے ممکن نہیں۔ شریعت صرف رسوم ظاہری کا نام ہے۔ جب تزکیۂ قلب اور انجلائے باطن حاصل ہوگا تو صوفی مکلف شریعت نہ رہا۔ اس نظریہ کی گمرہی اور اس سے جو وسوسے پیدا ہو سکتے ہیں اور جو فساد رونما ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ بہر حال مقصد یہ بتانا تھا کہ حافظ کے زمانے تک صوفیاء بیش تر شریعت سے بے نیاز تھے اور حقیقت طریقت سے بے خبر تھے۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ دل گیری[1]

''ارمغان حجاز'' میں ابلیس بھی مسلمانوں کو تصوف اور قوالی کی افیون دے کر تھپک تھپک کر سلا دینا چاہتا ہے، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ:

مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

ابلیس کی مجلس شوریٰ اس فیصلہ پر پہنچتی ہے کہ مسلمان کو بے عمل رکھنے کا طریقہ یہ ہے:

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

سعدی نے بھی صوفیوں کی امرد پرستی پر اعتراض کیا تھا اور جو جواز وہ پیش کرتے تھے اس کی تغلیط کی تھی۔ دیکھیے وہ اشعار جو یوں شروع ہوتے ہیں:

گروہے نشینند با خوش پسر که ما پاک بازیم و اہل نظر

ارباب علم کے ہاں تو صوفی بدنام ہوا ہی، عام بول چال میں بھی معاشرتی، ثقافتی اور مذہبی انتشار کی بناء پر کھرے خشک آدمی کو بھی صوفی کہنے لگے اور اس میں کچھ حقارت کا بھی عنصر شامل ہوتا ہے جیسے وہ شخص بیوقوف بھی ہو۔ یہی حالت کلمۂ نیک کی بھی ہوئی ہے جب ہم کہتے

---

1 - عین اس طرح جس طرح ملا بتدریج اپنی عظمت کھو بیٹھا کلمۂ صوفی بھی اپنی عظمت کھو بیٹھا۔ پہلے ملا کہتے تھے تو علم و فضل کا ایک دیو پیکر انسان مراد لیتے تھے، اب بالعموم ایک متعصب انسان کو کہتے ہیں، مثلاً جیسے پہلے ملا صدرا اور ملا جامی عظمت کی علامت تھے۔ اب عام طور پر لوگ ملا کے ساتھ ساتھ ''کٹھ'' بھی لگا دیتے ہیں، اور کٹھ ملا کہ کر ایک جھگڑالو شخص مراد لیتے ہیں جو مذہب کی روح سمجھنے سے بالکل عاری ہے۔ وہ اپنے تعصبات کی مدافعت کرتا ہے، اسے حق کی جستجو نہیں، وہ پیاسا نہیں، وہ سیراب ہو چکا ہے اور اب لوگوں کو سیراب کرنے کا مدعی ہے۔ جو اس کی بات نہ مانے وہ کافر ہے۔ یغمائے جندق نے کیا خوب کہا ہے:

ز شیخ شہر جان بردم بہ تزویر مسلمانی
مدارا گر بہ این کافر نہ می کردم چہ می کردم

ہیں کہ فلاں بہت نیک ہے تو مراد ہوتی ہے کہ بیوقوف بھی ہے۔[1]

محتسب : حافظ کے سلسلے میں میں محتسب کا ذکر بھی کرتا چلوں تو مناسب ہے کہ اس کلمہ کے تغیرات کے ساتھ حافظ کی زندگی کے ایک اور واقع کا گہرا تعلق ہے ۔ ہتی[2] لکھتا ہے : ''بلدیہ کے انتظامی افسروں میں سر فہرست محتسب تھا جس کے فرائض ایک حد تک پولیس کے فرائض سے مشابہ تھے ۔ اس کا یہ فرض تھا کہ منڈیوں میں ترازو اور باٹ کی صحت و سقم کا خیال رکھے ، اخلاق اقدار کی حفاظت کرے اور ایسی تدابیر اختیار کرے کہ خلاف شرع باتیں ، مثلاً جوا ، سود ، شراب فروشی کھلم کھلا سرزد نہ ہونے پائیں ۔ الماوردی لکھتا ہے کہ محتسب کا فرض تھا کہ وہ جنسی تعلقات پر کڑی نظر رکھے اور اس سلسلے میں اخلاق کے تقاضوں کو پورا کرے ۔ جو لوگ عورتوں میں ہر دلعزیز بننے کے لیے اپنی ریش سفید کو خضاب لگا لیتے تھے انہیں سزا دینا بھی محتسب کا فرض تھا ۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں منڈیوں کی دیکھ بھال مدت تک محتسب کے فرائض میں شامل رہی ۔ چنانچہ سلطنت ہسپانیہ کا ذکر کرتے ہوئے بھی ہتی محتسب کے یہ فرائض گنواتا ہے ۔

آل فاطمہ کے عہد میں بھی لوگ محتسب سے منڈیوں کی دیکھ بھال کی بھی توقع رکھتے تھے ، لیکن عجب بات ہے کہ بنو فاطمہ کے سلسلے میں ہتی نے یہ تصریح نہیں کی کہ خلاف شرع امور کے ارتکاب سے روکنا بھی محتسب کے فرائض میں شامل تھا ۔ جو صورت بھی ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ محتسب کو ایک محدود دائرے میں ہر قسم کے اختیارات تھے ۔ تاہم زبان شہادت دیتی ہے کہ احتساب کی صورت بگڑ گئی تھی اور محتسب اپنے فرائض کے معاملے میں یا غافل ہو گیا تھا یا حد سے بڑھ گیا تھا ۔ یہ مصرعہ زبان زد خاص و عام ہے :

محتسب را درون خانہ چہ کار

---

1 - کچھ شک نہیں کہ حضرت واعظ ہیں خوب شخص
علامۂ زماں ہیں بڑے فیلسوف ہیں
ذات شریف آپ کی مستجمع صفات
یہ اور بات ہے کہ ذرا بیوقوف ہیں

2 ۔ ''تاریخ عرب'' انگریزی لندن ، ۱۹۶۰ ، ص ۳۲۲ ، ۵۲۷ ، ۶۲۷ ۔

اسی طرح یہ شعر بھی مشہور ہے :

محتسب در قفائے رندان است غافل از صوفیان شاھد باز

اس شعر سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ صوفی تو شاھد باز تھے ھی محتسب بھی اسی تھیلی کے چٹے بٹے تھے ، یا اس قینچی کے دو پھل تھے کہ شراب نوشی کے معاملے میں تو گھروں میں بھی داخل ہو جاتے تھے لیکن شاھد بازی کو گوارہ کر لیتے تھے ۔ ھمارے ھاں کیونکہ اس قسم کا کوئی عہدہ ھی نہیں اس لیے اس کلمہ کی زوال پذیری عام طور پر لوگوں کے علم میں نہیں ۔ البتہ جن لوگوں کو حامیان دین مبین و مفتیان شرع متین کہا جاتا ہے ان کی باھمی آویزش اور چپقلش سے اخلاقی اقدار کی زوال پذیری کا سراغ ملتا ہے ۔ میں نے عرض کیا تھا کہ محتسب سے حافظ کی زندگی کا ایک خاص واقعہ مربوط ہے جو اس کلمہ کے معانی کی زوال پذیری اور معاشرے کے فساد کا مظہر ہے ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شاہ مبارزالدین محمد جو خاندان مظفریہ کا موسس اصلی تھا زھد ، تقویٰ اور پرھیز گاری میں بے نظیر زماں[1] گنا جاتا تھا ۔

اس بادشاہ نے احتساب میں بڑی سخت گیری برتی ۔ اگرچہ شراب کی فروخت سے خزانۂ عامرہ میں بہت روپیہ آتا تھا لیکن اس نے میخانے بند کروا دیے ۔ اس کی سخت گیری اور اس کے احتساب کی وجہ سے شیراز کے بگڑے دل لوگ اسے شاہ محتسب کہتے تھے ۔ میں نے بگڑے دل لکھنے کو تو لکھ دیا ہے لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ عباس اقبال اس معاملے کو یوں بیان کرتے ہیں کہ مبارزالدین دیندار ، عبادت گزار اور اطاعت شعار بادشاہ تھا ۔ امر معروف اور نہی منکر میں بڑی سختی سے کام لیتا تھا ۔ عباس اقبال کے قول کے مطابق (اب میں عیناً ان کے الفاظ نقل کرتا ھوں) ''اسی لیے شیراز کے باذوق بزلہ سنج باشندے اس سے ناخوش تھے اور اسے بادشاہ محتسب کہتے تھے ۔''[2] ظاھر ہے کہ خواجہ حافظ کو اس بات کا بہت صدمہ ھوا

---

1 ۔ مبارزالدین محمد امیر مظفر کا لڑکا تھا ۔ اس نے شاہ ابو اسحاق اینجو مربیٔ حافظ کو شکست فاش دی اور قتل کروا دیا ۔ اس نے ایک خاصی وسیع سلطنت کی بنیاد رکھی (سال مسند نشینی ۷۱۳ھ/۱۳۱۳ء ، سال وفات ۷۶۵ھ/۱۳۶۴ء ۔

2 ۔ عباس اقبال، ''تاریخ مفصل ایران'' (از حملۂ چنگیز تا تشکیل دولت تیموری) ۔

اور میخانوں کے جلسے[1] نہ رہے تو حافظ کے کلام میں محتسب کا کلمہ ایک علامتی اہمیت اور معنوی حیثیت حاصل کر گیا ہے ۔ اکثر وہ محتسب کہہ کر مبارزالدین مراد لیتے ہیں ۔ یہ بات حافظ کے کلام ''رموز و اسرار'' میں شامل ہے اور اس سے بے خبری ہو تو بہت سے اشعار جن میں محتسب کی تکرار ہو بے لطف معلوم ہونے لگتے ہیں ، لیکن جو علم اب ہمیں حاصل ہوا ہے اسے ملحوظ رکھ کر یہ شعر پڑھیے :

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گل بیزست بہ بانگ چنگ بخوریم کہ محتسب تیزاست
دانی کہ چنگ و عود چہ تقریر می کنند پنہاں خورید بادہ کہ تعزیر می کنند
مے خور کہ شیخ و حافظ و قاضی و محتسب چو نیک بنگری ہمہ تزویر می کنند

حافظ کی ایک غزل میں ایک شعر ایسا ہے کہ اگر محتسب کے صحیح معنی ہمیں معلوم نہ ہوں تو معنی کی اہمیت مخفی ہو جاتی ہے اور رموز و اسرار پوشیدہ رہتے ہیں ۔ وہ کہتا ہے :

محتسب داند کہ حافظ فاسق است و آصف ملک سلیمان نیزہم

ظاہری لغوی ترجمہ یہ ہوگا کہ محتسب کو بھی حافظ کا فسق معلوم ہے اور ایران کے وزیر کو بھی (ملک سلیمان استعارہ ہے ایران کے لیے اور آصف برخیا جو روایات کے اعتبار سے حضرت سلیمان کے وزیر اعظم تھے رمز ہے وزیر شاہ ایران کی) غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ زیادہ سے زیادہ اس شعر میں خوبی یہ نکلے گی کہ محتسب تو حافظ کے فسق سے آشنا ہے ہی، شاہ ایران کا وزیر بھی بے خبر نہیں ہے ۔ اس کے باوجود دونوں مصرعوں میں وہ ربط کامل اور وہ معنوی علاقہ نہیں پیدا ہوا جو حافظ کا خاصہ ہے ۔ لیکن جونہی ہم سمجھ گئے کہ محتسب سے مراد فرماں روائے ایران ہے ، یعنی شاہ مبارزالدین پھر تو معنی کی چولیں بالکل ٹھیک بیٹھ گئیں کہ بادشاہ بھی حافظ کے فسق و فجور سے آگاہ ہے اور وزیر بھی اور شاہ و وزیر کا تعلق واضح ہے ۔ اب حافظ کا ادعا یہ ٹھہرا کہ باوصف امتناع قانونی میں علی الرغم شاہنشاہ و وزیر پیتا ہوں اور ڈرتا نہیں ہوں۔[2]

---

1 - داغ کہتا ہے :
جمع ہیں پاک اک زمانے کے ہائے جلسے شراب خانے کے

2 - مصحفی کہتا ہے :
نفرت سے جو کوئی پیش آیا کج اپنی کلاہ ہم نے کرلی

یگانہ کہتا ہے :
پیاری دنیا کے چاؤ دیکھے ہیں بہت ٹیڑھے سیدھے سبھاؤ دیکھے ہیں بہت
کہہ پیر فلک تاؤ دکھاتا ہے مجھے ان آنکھوں نے تاؤ بھاؤ دیکھے ہیں بہت

حافظ نے باربار اپنے اس عزم کا اظہار کیا ہے کہ شاہ محتسب ہو یا شاہ پردہ پوش، میں اپنے مسلک پہ قائم رہوں گا :

من ترک عشق بازی و ساغر نمی کنم صد بار توبہ کردم و دیگر نمی کنم

اسی طرح جب شاہ شجاع میخانوں کو پھر کھلوانے جانے کا حکم دیتا ہے تو حافظ ایک غزل میں اس تقریب پر شاہ شجاع کو داد دیتا ہے :

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش کہ دور شاہ شجاع ایست می‌دلیر هوش

رموز مملکت خویش خسروان دانند گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش[1]

شراب : شراب کی داستان تصوف ہی کے سلسلے میں بیان ہو جائے تو موزوں ہے کہ اس مسلک کے ارباب کار نے ایسے زوال پذیر لفظ کو محبت الٰہی کی علامت بنا دیا ہے اور اس سے زیادہ خیرگی تصور میں نہیں آ سکتی - صورت واقعہ یہ ہے کہ اصلاً عربی میں اس کے معنی ہیں ہر شے رقیق کہ نوشیدہ شود ، و بہ اصطلاح اطباء بہ معنی شربت دوا - شراب بے بنفشہ بہ معنی شربت بنفشہ (''فرہنگ آنند راج'') - معلوم ہوا ہے کہ ہر رقیق پینے والی چیز شراب ہے - ان میں سب سے پہلے تو پانی ہے کہ مدار حیات اسی پر ہے - اسے شراب کہا جاتا تو نازک خیالی تھی کہ یہ مشروب ایسا ہے کہ اس کے بغیرانسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا ، لیکن انسان نے اپنی بداخلاقی کو چھپانے کے لیے شراب کا کامہ اس شے کے لیے استعمال کیا جو اور ناموں سے بھی یاد کی جاتی ہے کہ اس کی اصل اور اس کے اثرات کے آئینہ دار ہیں ، مثلاً بادہ - یہ ایک مرکب ہے کہ '' باد '' پر جوڑ ہے اور '' ہ '' اس میں نسبتی ہے کہ اس کے پینے سے سر میں ہوائے غرور پیدا ہوتی ہے جو آدمی کو اڑا کر کہیں کا کہیں لے جاتی ہے (''فرہنگ آنند راج'') - یہی وجہ ہے کہ صاحب ''بہار عجم'' نے اور صاحب ''آنند راج'' نے بادہ کی صفات گناتے ہوئے عقل سوز مرد آزما ، مرد افگن ، طاقت گزار اور پر زور کا بھی ذکر کیا - یار لوگوں نے یہ بھی کہا (مثلاً صاحب ''انجمن آرائے ناصری'') کہ '' ہ '' نسبت کی ضرور ہے لیکن باد سے بادہ بنایا تو مراد یہ ہوئی کہ اس میں

---

1 - حافظ کے دل میں ضرور خیال آیا ہوگا کہ باپ نے جو حکم دیا تھا بیٹے نے خلاف شرع اسے منسوخ کر دیا ، اس لیے مقطع میں ایک قسم کی معذرت (Apologia) پوشیدہ ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابھی حافظ کے وجود معنوی میں کوئی چنگاری نیکی کی کہیں سلگ رہی ہے -

ہوا کی سی لطافت موجود ہے ۔ شعراء نے اس توجیہ کو قبول کرتے ہوئے شعر بھی کہے ۔ مثالوں سے میں گریز کرتا ہوں ۔ جنھیں اشتیاق ہو وہ ناصری، آنند راج اور ''بہار عجم'' سے رجوع فرمائیں ۔ یہ توجیہ خود اخلاق انحطاط کی دلیل ہے ۔ بہر حال شراب کے لیے بادہ ہی نہیں ایک اور لفظ بھی موجود تھا ، یعنی خمر ، بالفتح ، و سکون رائے مہملہ یعنی آب انگور کہ مسکر بود (آنند راج) ۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو چیز نشہ پیدا کرتی ہے وہ خمر ہے کیونکہ جب مدینہ میں امتناع خمر کا حکم ہوا تو شراب انگوری کا نشان بھی نہ تھا ۔ البتہ شراب خرما ضرور پی جاتی تھی ، یعنی کھجور کی شراب ۔ صاحب ''فرہنگ آنند راج'' خمر کے معنی کا سلسلہ گنواتے ہوئے کہتے ہیں کہ پوشانیدن و پنہاں کردن و نہاں داشتن و نوشانیدن مے و شرم داشتن بھی اس کلمہ کی سرشت میں شامل ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ایک نکتہ طراز مصنف نے لکھا ہے کہ خمر شراب کو اس لیے کہتے ہیں کہ عقل کو ڈھانپ لیتی ہے ۔[1] اخلاق اقدار کو ملحوظ رکھنے والے اسے ام الخبائث کہتے ہیں کہ سب برائیوں کی جڑ ہے ۔ اس چیز کو ہمارے اخلاق انحطاط نے شراب کہہ کر نشہ آور مشروب کے لیے مخصوص کر لیا اور اب شراب سے نہ کوئی شربت مراد لیتا ہے نہ مشروب ، بلکہ وہی چیز مراد لی جاتی ہے جس کی تحریم کر دی گئی ہے اور اسے ہم شراب کہہ کر گویا اپنے اخلاق زوال پر مہر لگا دیتے ہیں ، جسے حرام کیا گیا وہ ہمارے لیے پینے والی چیز ہے ۔

شراب کی جو صفات ''بہار عجم'' اور ''فرہنگ آنند راج'' نے گنوائی ہیں ان کو نقل کرنے کے لیے دفتر چاہیے ، لیکن کچھ سن لیجیے کہ کچھ اندازہ ہوجائے کہ اس حرام چیز کو ہم نے کن خوبصورت ناموں سے پکارا ۔ آب طرب ، آب حیات ، دختر آفتاب ، آتش سیال ۔ اگر ایرانی جن کے لیے مئے مغانہ حلال تھی اس کے لیے صفات دلفریب لائیں تو تعجب کی کوئی بات نہیں ۔ ہمارا یہ مسلک کہ آنکھیں بند کرکے فارسی کی روایت شعری کی پیروی کرتے ہیں بہت سی خرابیوں کا موجب ہوا ہے ۔

تصوف کے اہل کار ارباب کار نے اوراہل اقتدار نے اپنی تمام علامتیں شراب

---

1 ۔ ''سرگذشت الفاظ'' مذکور ، ص ۱۱۱ ۔

سے مشتق کیں ۔ چنانچہ ''فرہنگ صوفیہ''[1] میں کچھ درج ہیں ۔ اور باقی ''گلشن راز'' محمود شبستری میں مل جائیں گی ، یہاں تک کہ خرابات اولیاء اور صوفیاء کے حلقۂ ذکر و فکر کو کہنے لگے اور پیر مغاں انسان کامل کو اور مرشد کو جام دل ٹھہرا اور پھر تمام متعلقہ کوائف شراب اس سے مربوط کر دیے گئے ۔ بظاہر یہ الفاظ کو بلند کرنے کی سعی ہے ، لیکن دراصل اخلاق انحطاط کی دلیل ہے کہ ہم نے عرفانی اور اخلاق حقائق کی علامتوں کے لیے جو الفاظ انتخاب کیے ان کا تعلق شراب و خرابات سے ہے ۔

خمار : خمار دراصل بقیہ مستی ہے اور درد سر اور اعضاء شکنی ، لیکن ہم نے اس کیفیت کو جو شراب پینے سے پیدا ہوتی ہے ، دلفریب سمجھا ۔ چنانچہ ساقی کی خمار آلود آنکھیں بھی دلفریب ہیں ، خمار شراب پینے کے مضر اثرات کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے لیکن شعراء محبوب کی خمار یں آنکھوں میں دل آویزی اور جمال بھی دیکھتے ہیں ، مثلاً

رہود از این دلم آن زلف بے قرار قرار نہاد در سرم آن چشم پر خمار خمار
گہ ز چشمش مست بودم گہ خمار گہ ز زلف مشک بویش بے قرار
روزے کہ از شراب و ز ساغر نہ بودنام جانم ز جام وصل تو مست خمار بود

کلمۂ خمار بھی معشوق کی چشم مست کی دل آویزی کے لیے استعمال ہوتا ہے ، حالانکہ اس کے لغوی معنی مے فروش کے ہیں ، لیکن صفات چشم میں یہ دلفریبی کہ معانی کو محیط ہو جاتا ہے ۔ صائب کہتا ہے :

توبہ را می کند خراباتی چشم میگون و چشم خمارش

گویا خمار اب درد سر کی بجائے سرور کے لیے اور دلفریبی کے لیے استعمال ہونے لگا ۔ مراد یہ ہے کہ ہمارا اخلاق انحطاط اس درجہ تک پہنچ چکا ہے کہ شراب کے اثرات مضر بھی ہمیں پسند آتے ہیں اور ہم ان پر بھی دل و جان سے فدا ہوتے ہیں ۔ اس زوال پذیری کی کوئی حد ہے کہ ہم نے نقصان کو نفع میں تبدیل کر لیا ، زیاں کو سود میں ، بدی کو نیکی میں ، فساد کو انتظام

---

1 ۔ وہی ''فرہنگ مصطلحات صوفیہ'' یا ''فرہنگ اصطلاحات صوفیہ'' جو معین نے آثار و افکار و احوال حافظ کی جلد دوئم میں ضمیمہ کے طور پر شامل کر دیا ہے ۔ اس میں شرب کے کلمہ کی تشریح یوں کی گئی ہے : حلاوت ، طاعت و لذت ، کرامت و راحت ۔ انس را ابن طائفہ شرب خوانند (ہجویری) :
''شرب وسط تجلیات الٰہی است همه طور ذوق اول تجلیات الٰہی است''

میں ، انتشار کو اجتماع میں ۔

اردو شعراء میں شاید اب یہ روایت کی اندھی پیروی کا نتیجہ ہو لیکن گیا وقت نہیں گیا کہ ہم چشم خمار آلود کے صبح معنی دریافت کریں اور اپنے اخلاقی انحطاط کا جائزہ لیں ؟ کیا عرفانی حقائق کی علامتوں کے لیے صرف شراب اور اس کے متعلقات ھی باقی رہ گئے تھے کہ ہم نے ایک طلسمی قصر تعمیر کر لیا جس میں ام الخبائث پری کے روپ میں جلوہ فگن ہے :

خدا کی شان تو دیکھو کہ کاچڑی کنجی حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی
چڑیل کی تو ہو شکل اور دماغ پریوں کا

ریش قاضی : قاضی کا مقام کسی سے پوشیدہ نہیں کہ انفصال مقدمات میں حقیقت دریافت کرنا اسی کا کام تھا اور بادشاہ اس عہدے کے لیے ایسے شخص کا انتخاب کرتے تھے جس کی پرہیزگاری اور تقویٰ مسلم ہو اور دیانتداری شکوک و شبہات سے بالاتر ۔ پھر ان کی ریش کو کیا عظمت و تقدس حاصل ہوگا ، لیکن ہماری خیرہ چشمی اور بے حیائی دیکھیے کہ شیشۂ شراب پر اور کدوئے شراب پر جو کپڑا باندھا جاتا ہے یا ڈاٹ دیا جاتا ہے اسے ریش قاضی کہتے ہیں ۔ کبھی کبھی روئی بھی استعمال ہوتی ہے ۔ چنانچہ خان آرزو کہتے ہیں :

چناں رسوا نمودم تقویٰ دیرینۂ خود را
کہ کردم ریش قاضی خرقۂ پشمینۂ خود را

یہ ایک مثال مشتے نمونہ از خروارے ہے ۔ باقی مثالوں کے لیے لغت کی مستند کتابوں سے رجوع فرمائیے ۔ ایک طلسمات کا علم نظر آئے گا اور اپنی بد اخلاقی کا ثبوت ان لفظوں میں مہیا ہو جائے گا جو جھوٹ نہیں بولتے ۔

مست : لغوی طور پر اس لفظ کے معنی ہیں جو ہوشیار نہ ہو (''فرہنگ آنند راج'') ۔ ہماری خیرہ چشمی دیکھیے کہ پہلے مست سے مراد یہ لی کہ کوئی شخص شراب کے نشہ سے متاثر ہے ، پھر مستی کی اس حالت کو چھپانے کے لیے ایسے الفاظ برتے جو معاملہ کی قباحت پر پردہ ڈالیں ، مثلاً مست شراب کو سرخوش کہتے ہیں ۔ یہ بھی محاورہ ہے کہ فلاں کو چڑھ گئی ۔ یہاں شراب محذوف ہے ۔ محض پینا شراب پینے کے لیے مستعمل ہے ۔ اکبر کہتا ہے کہ :

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے
ڈاکہ تو نہیں ڈالا چوری تو نہیں کی ہے

یہاں شراب محذوف کرنے سے پھر قباحت کی پردہ پوشی کی گئی ہے ۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ مست لغوی طور پر ہوشیار کی ضد تھا ، لیکن

ہم نے مست کو مست شراب سمجھ کر اور کیفیت نشاط تصور کرکے مست اور مستی کے مدارج قائم کیے ۔ چنانچہ مست بھی ہے ، سرمست بھی ہے ، بد مست بھی ہے ، سیاہ مست بھی ہے ۔ اس میں سرمست تو سرور کا دلفریب درجہ ہے ۔ بد مستی اور سیاہ مستی البتہ کاہہ کی قباحت کی دلیلیں ہیں ، لیکن یہ تو ثابت ہوگیا کہ ہم تھوڑی سی پی کر جو عالم کیف و سرور پیدا ہوتا ہے اسے قبیح نہیں گردانتے ۔ ہم لکھتا ہے کہ سر مست شراب پیے ہوئے ، لیکن ساتھ ہی کہتا ہے کہ سرخوش بھی دیکھیے ۔ اور سرخوش کے معنی لکھتا ہے شراب پی کر جو عالم سرور میں ہو ۔ صرف یہی نہیں ہم مست کے معنی کے سلسلے میں یہ بھی کہتا ہے کہ وجد و سرور کی کیفیت کو بھی مستی کہتے ہیں ۔ لب لباب بحث کا یہ کہ ہم نے اب کیف و سرور کو نہ صرف مستی سے مخصوص کر دیا بلکہ خوشی کو بھی شراب ہی سے منسوب کیا جیسا کہ ہم نے سرخوش کے ماتحت تصریح کر دی ۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006